کو نہیں جانے دیتیں کہ وہ نے اپنی مدد آپ کر سکتا ہے۔ اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔

صوفیہ تھوڑی دیر تک گہری سوچ بچار میں خاموش بیٹھی رہی۔ وہ نے کی مردانہ صورت اس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ یکا یک اس نے سر اٹھایا اور طے شدہ طریقہ پر بولی۔ ''میں اودے پور جاؤں گی۔''

پربھو سیوک: وہاں جا کر کیا کرو گی؟

صوفیہ: یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہاں جا کر کیا کروں گی۔ اگر اور کچھ نہ کر سکوں گی تو کم از کم جیل میں رہ کر وہ نے کی خدمت تو کر سکوں گی۔ اپنی جان تو ان پر قربان کر دوں گی۔ میں نے ان کے ساتھ جو بے وفائی کی ہے خواہ کسی ارادہ سے کی ہو، وہ ہر وقت میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھا کرتی ہے۔ اس سے ان کو جو رنج ہوا ہو گا اس کا خیال آتے ہی میرا دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ اب میں اس گناہ کا کفارہ کروں گی۔ کسی اور طریقہ پر نہیں تو اپنی جان دے کر۔

یہ کہہ کر صوفیہ نے کھڑکی سے جھانکا تو مسٹر کلارک ابھی تک کھڑے مسز سیوک سے باتیں کر رہے تھے۔ موٹر بھی کھڑی تھی۔ وہ فوراً باہر آ کر مسٹر کلارک سے بولی۔ ''ولیم آج ماما ہی سے باتیں کرنے میں رات ختم کر دو گے؟ میں سیر کرنے کے لیے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

لہجہ کتنا شیریں تھا۔ کس دلربایانہ انداز سے کنول جیسی آنکھوں میں دلفریب ہنسی کا کتنا جادو بھر کر یہ محبت آمیز التجا کی گئی تھی۔ کلارک نے معذرت آمیز نگاہوں سے صوفیہ کو دیکھا۔ ''یہ وہی صوفیہ ہے جو ابھی ذرا دیر پہلے میرا مضحکہ اڑا رہی تھی۔'' اسوقت پانی پر آسمان کا تاریک عکس تھا۔ اب اسی پانی پر چاند کی سنہری کرنیں ناچ رہی تھیں۔ اسی لہراتے ہوئے پانی کا کانپتا ہوا ہنستا ہوا اور شوخی سے بھرا جلوہ اس کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ وہ نادم ہو کر بولے۔ ''پیاری معاف کرو۔ مجھے خیال ہی

نہیں رہا۔ باتوں میں دیر ہوگئی۔''

صوفیہ نے ماں کی طرف سادگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ماما دیکھتی ہو ان کی بے رخی۔ یہ ابھی سے مجھ سے تنگ آ گئے ہیں۔ میری اتنی یاد بھی نہ رہی کہ ایک بار تو رفع شکایت ہی کے لیے پوچھ لیتے، سیر کرنے چلی گی؟''

مسز سیوک: ہاں۔ ولیم! یہ تمہاری زیادتی ہے۔ آج صوفیہ نے تمہیں آلودہ ہاتھوں گرفتار کرلیا۔ میں تمہیں بے خطا سمجھتی تھی اور صرف اسی کو خطاوار۔

کلارک نے کچھ مسکرا کر اپنی خفت مٹائی اور صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر موٹر کی طرف چلے۔ مگر اب بھی انہیں شک تھا کہ میرے ہاتھ میں جو نازک کلائی ہے وہ دراصل کوئی شے ہے یا محض خواب وخیال۔ معما اور بھی پیچیدہ ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ کوئی بندر نچانے والا مداری ہے یا کوئی معصوم بچہ جو بندر کو دور سے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اسے مٹھائی دیتا ہے مگر بندر کے نزدیک آتے ہی خوف سے چیخنے لگتا ہے۔

جی موٹر چلی تو صوفیہ نے کہا۔ ''پولیٹکل ایجنٹ کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں وہ چاہے تو ریاست کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کرسکتا ہے کیوں؟''

کلارک نے خوش ہو کر کہا۔ ''اس کا اختیار سب جگہ یہاں تک کہ راجہ کے محل کے اندر بھی ہوتا ہے۔ ریاست کا ذکر ہی کیا وہ راجہ کے کھانے سونے آرام کرنے کا وقت تک معین کرسکتا ہے۔ راجہ کس سے ملے، کس سے دور رہے، کس کی عزت کرے، کس کی بے عزتی کرے یہ سب باتیں ایجنٹ کے اختیار میں ہیں۔ وہ یہاں تک طے کرسکتا ہے کہ راجہ کی میز پر کون کون سے کھانے آئیں گے۔ راجہ کے لیے کتنے اور کیسے کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔ یہاں تک کہ وہ راجہ کی شادی کے متعلق بھی فیصلہ دے سکتا ہے۔ بس یہی سمجھو کہ وہ ریاست کا خدا ہوتا ہے۔''

صوفیہ: تب تو وہاں سیر تفریح کے لیے بھی کافی موقع ملے گا۔ یہاں کی طرح تمام دن دفتر میں تو نہ بیٹھنا پڑے گا؟

کلارک: وہاں کیسا دفتر۔ ایجنٹ کا کام دفتر میں بیٹھنا نہیں ہے۔ وہ وہاں ملک معظم کا قائم مقام ہوتا ہے۔

صوفیہ: اچھا تم جس ریاست میں چاہو جا سکتے ہو؟

کلارک: ہاں۔ صرف پہلے سے کچھ خط و کتابت کرنی پڑے گی۔ تم کون سی ریاست پسند کرو گی؟

صوفیہ: مجھے تو کوہستانی علاقوں سے خاص انس ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں بسے گاؤں۔ پہاڑوں کی گود میں چرنے والی بھیڑیں اور پہاڑوں سے گرنے والے آبشار۔ یہ سبھی مناظر مجھے شعریت سے مملو معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسری ہی دنیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ پرسکون و دلکش کوہستان میرے لیے ایک دل کش خواب ہے۔ پہاڑوں میں کون کون سی ریاستیں ہیں؟

کلارک: بھرت پور، جودھ پور، اودے پور.....

صوفیہ: بس تم اودے پور کے لیے لکھو۔ میں نے تاریخ اودے پور کی جوش بھری داستانیں پڑھی ہیں اور جبھی سے مجھے اس علاقہ کے دیکھنے کا شوق ہے۔ وہاں راجپوت کتنے بہادر، کتنے آزادی پسند، کتنے آن پر جان دینے والے ہوتے ہیں۔ لکھا ہے کہ چتوڑ میں جتنے شہید ہوئے ان کے زناروں کا وزن پچھتر من تھا۔ کئی ہزار راجپوتنیاں ایک ساتھ چتا میں جل کر خاک ہو گئیں۔ ایسی بات پر مٹ جانے والی ہستیاں دنیا میں شاید ہی اور کہیں ہوں۔

کلارک: ہاں یہ واقعات میں نے بھی تاریخ میں دیکھے ہیں۔ ایسی جانباز قوم کی جتنی عزت کی جائے کم ہے۔ اسی لیے تو اودے پور کا راجہ ہندو راجاؤں میں افضل ترین سمجھا جاتا ہے۔ ان کی بہادری کی داستانیں بہت کچھ مبالغہ آمیز ہیں۔ پھر بھی یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اس ملک میں ایسی جانباز دوسری قوم نہیں۔

صوفیہ: تم آج ہی اودے پور کے لیے لکھو اور ممکن ہو تو ہم لوگ ایک ماہ کے اندر

وہاں کو روانہ ہو جائیں۔

کلارک: لیکن.... کہتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے.....تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو گی..... یہاں سے چلنے کے قبل میں تم سے وہ دیرینہ.....میری زندگی....

صوفیہ نے مسکرا کر کہا۔ ''میں سمجھ گئی۔ اسے ظاہر کرنے کی تکلیف نہ اٹھاؤ۔ اتنی کوتاہ فہم نہیں ہوں، لیکن میری قوت فیصلہ نہایت سست ہے۔ یہاں تک کہ سیر کرنے کے لیے جانے کا فیصلہ بھی میں گھنٹوں تک سوچنے کے بعد ہی کر سکتی ہوں۔ ایسے اہم معاملہ میں جس کا تعلق عمر بھر رہے گا۔ میں اتنی جلد کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی بلکہ صاف بات تو یہ ہے کہ میں ہنوز یہی فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھ جیسی بے فکر او رآزاد خیال عورت متاہلانہ زندگی کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ ولیم میں تم سے دل کی بات کہتی ہوں۔ خانہ داری کی زندگی سے مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے تم جب تک میرے مزاج سے بخوبی واقف نہ ہو جاؤ۔ میں تمہارے دل میں جھوٹی امیدیں پیدا کر کے تمہیں مغالطہ میں نہیں رکھنا چاہتی۔ ابھی میری اور تمہاری ملاقات صرف ایک سال سے ہے۔ اب تک میں تمہارے لیے ایک سربستہ راز ہوں۔ کیوں ہے یا نہیں؟''

کلارک: ہاں صوفیہ واقعی تمہیں بخوبی نہیں پہچان پایا ہوں۔

صوفیہ: پھر ایسی حالات میں تمہی سوچو کہ ہم دونوں کا رشتۂ عقد میں بندھ جانا کتنی بڑی نادانی ہے۔ میرے دل کی جو پوچھو تو مجھے ایک نیک دل، شریف، خوش فہم اور خوش اخلاق شخص کے ساتھ دوست بن کر رہنا اس کی بیوی بن کر رہنے کے مقابلہ میں کم پر لطف نہیں معلوم ہوتا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کا مجھے علم نہیں، لیکن میں زن وشوہر کے تعلق کو دو دلوں کے ملاپ کی بہترین صورت نہیں خیال کرتی۔ میں باہمی رہائش و ہمدردی کو نفس پرستی والے تعلقات سے بدرجہا بہتر سمجھتی ہوں۔

کلارک: مگر جماعتی اور مذہبی رسم و رواج ایسے تعلقات کو.....

صوفیہ: ہاں ایسے تعلقات فطرت کے منافی ہوتے ہیں اور معمولاً ناقابل عمل۔

میں بھی اسے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی کا اصول بنانے کو تیار نہیں ہوں، لیکن جب تک ہم ایک دوسرے کے سامنے آئینہ نہ بن جائیں، اس وقت تک میں اسی قسم کے تعلقات کو ضروری خیال کرتی ہوں۔

کلارک: میں تمہاری مرضی کا غلام ہوں۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے بغیر میری زندگی وہ مکان ہے جس میں مکین نہیں۔ وہ چراغ ہے جس میں روشنی نہیں۔ وہ شعر ہے جس میں تاثیر نہیں۔

صوفیہ: بس بس یہ عاشقانہ گفتگو صرف عشقیہ کتب کے لیے زینت بخش ہے۔ یہ لو پانڈے پور آ گئے۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔ سورداس چلا گیا ہوگا۔ یہ حال سنے گا تو اس غریب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

کلارک: اس کی پرورش کا کوئی اور بندوبست کر دوں؟

صوفیہ: اس زمین سے اس کی پرورش نہیں ہوتی تھی۔ صرف محلّہ کے مویشی چرا کرتے تھے۔ وہ غریب ہے۔ بھکاری ہے پر لالچی نہیں۔ مجھے تو وہ کوئی ولی اللہ معلوم ہوتا ہے۔

کلارک: اندھے ذہین اور خدا ترس ہوتے ہیں۔

صوفیہ: مجھے اس سے خاص عقیدت ہو گئی ہے۔ یہ دیکھو پاپا نے کام شروع کر دیا۔ اگر انہوں نے رلیہ کی پیٹھ نہ ٹھونکی ہوتی تو انہیں تمہارے سامنے آنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔

کلارک: تمہارے پاپا نہایت چالاک ہوشیار ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کم از کم میں یہ دورخی چال نہیں چل سکتا۔

صوفیہ: دیکھ لینا دو ہی چار برسوں کے اندر اس محلّہ میں کارخانہ کے مزدوروں کے مکانات ہوں گے۔ یہاں کا ایک آدمی بھی نہ رہنے پائے گا۔

کلارک: پہلے تو اس اندھے نے بڑا شور و غل مچایا تھا۔ دیکھیں اب کیا ہو سکتا ہے۔

صوفیہ: مجھے تو یقین ہے کہ وہ خاموش نہ بیٹھے گا۔ خواہ اس زمین کے ساتھ ہی ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

کلارک: نہیں صوفیہ ایسا ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ جس روز یہ نوبت آئے گی سب سے پہلے سورداس کے لیے میری زبان سے ''جے'' کی آواز نکلے گی اور سب سے پہلے میرے ہاتھ اس پر پھول برسائیں گے۔

صوفیہ نے کلارک کو آج پہلی بار ہی عزت و محبت کی نظر سے دیکھا۔

(25)

سال بھر تک راجہ مہیندر کمار اور مسٹر کلارک میں متواتر جنگ ہوتی رہی۔ کاغذ کا تختہ میدان کارزار تھا اور صف بستہ سورماؤں کے بجائے سورماؤں سے کہیں زیادہ طاقت ور دلیلیں۔ منوں سیاہی بہہ گئی۔ کتنے ہی قلم کام آئے۔ دلیلیں کٹ کٹ کر راون کی فوج کی طرح پھر زندہ ہو جاتی تھیں۔ راجہ صاحب بار بار ہمت ہار جاتے۔ سرکار سے مقابلہ کرنا چیونٹی کا ہاتھی سے مقابلہ کرنا ہے لیکن مسٹر جان سیوک اور ان سے بھی زیادہ اندوانہیں ڈھارس دیتی رہتی تھیں۔ شہر کے رئیسوں نے ہمت سے کم اور خود غرضانہ دانشمندی سے زیادہ کام لیا۔ اس عرض داشت پر جسے ڈاکٹر گنگولی نے باشندگان شہر کی جانب سے گورنر کی خدمت میں بھیجنے کے لیے لکھا تھا۔ دستخط کرنے کے وقت زیادہ تر لوگ بیمار ہو گئے اور اس قدر بیمار ہو گئے کہ ہاتھ میں قلم پکڑنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ کوئی تیرتھ جاترا کرنے چلا گیا۔ کوئی کسی نہایت ضروری کام سے کہیں باہر روانہ ہو گیا۔ جو گنے گنائے لوگ کوئی بہانہ نہ کر سکے، وہ بھی دستخط کرنے کے بعد مسٹر کلارک سے معافی مانگ آئے۔ ''حضور نہ جانے اس میں کیا کیا لکھا تھا۔ ہمارے سامنے تو صرف سادہ کاغذ آیا تھا۔ ہم سے یہی کہا گیا کہ یہ پانی کا محصول گھٹانے کی درخواست ہے۔ اگر ہم کو معلوم ہوتا کہ اس سادہ کاغذ پر بعد کو حضور کی شکایت لکھی جائے تو ہم بھول کر بھی قلم نہ اٹھاتے۔''

ہاں جن بڑے لوگوں نے سگریٹ کمپنی کے حصے لیے تھے انہیں مجبور ہو کر دستخط کرنا ہی پڑے۔ اگر چہ دستخط کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی مگر ڈاکٹر گنگولی کو کونسل میں سرکار سے سوال کرنے کا ایک حیلہ مل گیا۔ انہوں نے بڑے حوصلہ اور استقلال کے ساتھ سوالوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ کونسل میں ڈاکٹر صاحب کا خاص احترام ہوتا تھا۔ کتنے ہی ممبروں نے ان سوالات کی تائید کی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر گنگولی کی ایک تجویز پر کثرت رائے کی وجہ سے سرکار کو ہار ماننی پڑی۔ اس تجویز سے لوگوں کو بڑی بڑی امیدیں تھیں، لیکن جب اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا تو جگہ جگہ سرکار پر بداعتقادی ظاہر کرنے کے لیے جلسے ہونے لگے۔ رئیسوں اور زمینداروں کی تو خوف کے سبب زبان بند تھی لیکن درمیانی طبقہ کے لوگوں نے کھلے الفاظ اس زبردستی کی مخالفت کرنا شروع کی۔ کنور بھرت سنگھ ان کے سرغنہ بنے اور وہ صاف صاف کہنے لگے کہ اب ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ ہماری نجات اپنے ہی ہاتھوں ہوگی۔ مہیندر کمار بھی در پردہ اس جماعت کا دل بڑھانے لگے۔ ڈاکٹر گنگولی کے بہت کچھ تشفی دینے پر بھی حکام پر سے ان کا اعتبار اٹھ گیا۔ مایوسی ضعف سے پیدا ہوتی ہے مگر وہ خود قوت کو پیدا کرتی ہے۔

رات کے نو بج گئے تھے۔ ونے سنگھ کی گرفتاری و قید کی خبر پا کر کنور صاحب نے اپنے احباب کو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر گنگولی، جان سیوک، پربھو سیوک، راجہ مہیندر کمار اور دیگر اصحاب آئے ہوئے تھے۔ اندو بھی راجہ صاحب کے ہمراہ آئی تھی اور اپنی والدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ کنور صاحب نے نائیک رام کو بلا کر بھیجا تھا اور وہ کمرہ کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تمباکو مل رہا تھا۔

مہیندر کمار بولے۔ ''ریاستوں پر سرکار کا بڑا دباؤ ہے۔ وہ بالکل بے دست و پا ہیں اور سرکار کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور۔''

بھرت سنگھ نے کہا۔ ''جس سے کسی کا فائدہ نہ ہو اور جس کا وجود مضرت رسانی پر مبنی

ہو۔اس کا نام ونشان جتنا ہی جلد مٹ جائے اتنا ہی اچھا۔غیر ملکی لوگوں کے ہاتھوں میں ظلم وتشدد کا آلہ بن کر زندہ رہنے کی بہ نسبت تو مر جانا ہی بہتر ہے۔''

ڈاکٹر گنگولی: وہاں کا حاکم لوگ کھود (خود) کھراب ہے۔ڈرتا ہے، ریاست میں اچھے اورنڈرتا کے کھیال (خیال) پھیلیں گے تو ہم رعایا کو کیسے لوٹے گا۔راجہ لوگ مسند لگا کر بیٹھا رہتا ہے اور اس کا نوکر چاکر من مانا راج کرتا ہے۔

جان سیوک نے غیر جانبدارانہ طریق سے کہا۔''سرکار کسی ریاست کو ظلم کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتی۔ہاں چونکہ وہ کمزور ہیں اور اپنی حفاظت آپ نہیں کرسکتیں اس لیے ایسے کاموں کے کرنے پر ضرورت سے بھی زیادہ تیار ہو جاتی ہیں۔جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ سرکار بہادر خوش ہوگی۔''

بھرت سنگھ: ونے سنگھ کتنا سلیم، کتنا متواضع، کتنا خلیق ہے۔یہ آپ لوگوں سے مخفی نہیں۔میں اسے باور نہیں نہیں کرسکتا کہ اس کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

پربھو سیوک کنور صاحب کے منہ لگے ہوئے تھے۔اب تک جان سیوک کے خوف سے نہ بولے تھے۔پر اب نہ رہا گیا۔بولے۔''کیوں، کیا پولیس سے چوروں کو نقصان نہیں پہنچتا؟ کیا سادھوؤں سے بدکاروں کو نقصان نہیں پہنچتا؟ اور پھر گائے جیسی بے زبان ومفید مخلوق کا خون بہانے والے لوگ دنیا میں نہیں ہیں؟ ونے نے مظلوم کسانوں کی خدمت کرنی چاہی تھی۔اسی خدمت کا انہیں یہ صلہ ملا ہے۔رعایا کے صبر وبرداشت کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے اور ہوتی بھی ہے۔اس سے متجاوز ہو کر قانون قانون ہی نہیں رہ جاتا۔اس وقت اس قانون کی خلاف ورزی کرنا ہی ہر سمجھ دار آدمی کا فرض ہو جاتا ہے۔اگر آج سرکار حکم دے کہ سب لوگ منہ میں کالک لگا کر نکلیں تو اس حکم کو نہ ماننا ہمارا فرض ہو جائے گا۔اودے پور کے دربار کو کوئی یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی شخص کو ریاست سے نکل جانے پر مجبور کرے۔''

ڈاکٹر گنگولی: اودے پور کا دربار ایسا حکم دے سکتا ہے۔اس کا اختیار ہے۔

پربھوسیوک: میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ جس حکم کی بنیاد محض حیوانی طاقت پر ہو، اس کی تعمیل ضروری نہیں۔ اگر اودے پور میں کوئی ذمہ دار سرکار ہوتی اور وہ کثرت رائے سے ایسا حکم نافذ کرتی تو دوسری بات تھی مگر جب کہ رعایا کی جانب سے اس قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ وہ خود دونے سنگھ کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے تو محض حکام کی جبر پسندی ہمیں ان کے حکم کی تعمیل کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔

راجہ صاحب نے ادھر ادھر خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا کہ یہاں کوئی میرا دشمن تو نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ جان سیوک بھی تیوریاں بدلنے لگے۔

ڈاکٹر گنگولی: ہم دربار سے لڑ تو نہیں سکتا۔

پربھوسیوک: رعایا کو اپنے حقوق کی حفاظت پر آمادہ تو کر سکتے ہیں۔

بھرت سنگھ: اس کا نتیجہ بغاوت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور بغاوت کو فرو کرنے کے لیے دربار گورنمنٹ سے مدد لے گا۔ مفت ہزاروں بیکسوں کا خون ہو جائے گا۔

پربھوسیوک: جب تک ہم خون سے ڈرتے رہیں گے، ہمارے حقوق بھی ہمارے پاس آنے سے ڈرتے رہیں گے۔ ان کی حفاظت بھی تو خون ہی سے ہوگی۔ میدان سیاست میدان جنگ سے کم خطرناک نہیں ہے۔ اس میں اتر کر خون سے ڈرنا محض بزدلی ہے۔

جان سیوک سے اب ضبط نہ ہو سکا بولے۔ ''تم جیسے پرجوش نوجوانوں کو ایسے پیچیدہ سیاسی معاملات پر کچھ کہنے سے پہلے اپنے الفاظ کو خوب تول لینا چاہیے۔ یہ موقع تدبر اور دور اندیشی سے کام لینے کا ہے۔''

پربھوسیوک نے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ تدبر بزدلی کا مترادف ہے۔

ڈاکٹر گنگولی: میری رائے میں گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں ایک ڈیپوٹیشن جانا چاہیے۔

بھرت سنگھ: گورنمنٹ کہہ دے گی ہمیں دربار کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں۔

مہیندر کمار: دربار ہی کو کیوں نہ ڈیپوٹیشن بھیجا جائے؟

جان سیوک: ہاں یہ میری بھی صلاح ہے۔ریاست کے خلاف شورش کرنا ریاست کو کمزور بنا دیتا ہے اور رعایا کو سرکش۔ ریاست کا اقتدار ہر ایک حالت میں قائم رہنے دینا ضروری ہے ورنہ اس کا انجام وہی ہوگا جو آج جمہوریت و مساوات کے عالم گیر نظارہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ دنیا نے تین صدیوں تک جمہوریت کی آزمائش کی اور بالآخر اس سے ناامید ہوگئی۔ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس آگ کی لپٹ ابھی تک اس ملک میں نہیں پہنچی اور ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم آئندہ بھی اس سے محفوظ رہیں۔

کنور بھرت سنگھ جمہوریت کے ایک گونہ معتقد تھے۔اپنے اصول کی تردید ہوتے دیکھ کر بولے۔''پھوس کا جھونپڑا بنا کر آپ آگ کی لپٹ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ بہت ممکن ہے کہ لپٹ کے باہر سے نہ آنے پر بھی گھر ہی کی ایک چنگاری اڑ کر اس پر گر پڑے۔آپ جھونپڑا رکھیے ہی کیوں؟ جمہوریت حکومت کا بلند ترین معیار نہ سہی مگر دنیا ابھی تک اس سے بہتر طرز حکومت نہیں بتلا سکتی۔خیر جب یہ طے ہوگیا کہ ہم دربار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے تو بجز صبر اور کیا چارہ ہے۔ میں سیاسی حالات میں الگ رہنا چاہتا ہوں کیونکہ اس سے کوئی نفع نہیں۔آزادی کی قیمت خون ہے۔جب ہم میں اس کے دینے کی طاقت ہی نہیں تو ہم بے فائدہ کمر کیوں باندھیں۔ پینترے کیوں بدلیں۔خم کیوں ٹھونکیں؟ سب سے الگ تھلگ رہنے میں بھلائی ہے۔''

پربھو سیوک: یہ تو بہت مشکل ہے کہ آنکھوں سے اپنا گھر لٹتے دیکھیں اور زبان نہ کھولیں۔

بھرت سنگھ: ہاں بہت مشکل ہے۔ مگر اپنے نفس پر قابو رکھنا ہوگا۔ اس کی یہی تدبیر ہے کہ ہم کلہاڑی کا دستہ نہ بنیں۔ دستہ کلہاڑی کی مدد نہ کرے تو کلہاڑی سخت اور تیز ہونے پر بھی ہمیں سخت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہ ہمارے لیے بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم علم، ثروت یا دولت کے زعم میں حکومت کا دایاں ہاتھ بن کر رعایا کا گلا کاٹیں اور اس بات پر فخر کریں کہ ہم بھی حاکم ہیں۔

جان سیوک: تعلیم یافتہ طبقہ ہمیشہ سے حکومت کے سہارے رہا ہے اور رہے گا۔ حکومت سے منحرف ہو کر وہ اپنی ہستی کو نہیں مٹا سکتا۔

بھرت سنگھ: یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ جب تک حکومت سے وابستہ رہے گا۔ ہم اپنے معیار کے قریب ذرا بھی نہ پہنچ سکیں گے۔ اس کو اپنے لیے تھوڑے، بہت دنوں کے لیے کوئی دوسرا سہارا کھوجنا پڑے گا۔

راجہ مہیندر مار بغلیں جھانک رہے تھے کہ یہاں سے کھسک جانے کا کوئی موقع مل جائے۔ اس قضیہ کو تمام کرنے کے ارادہ سے بولے۔ ''تو آپ لوگوں نے کیا تجویز کیا۔ دربار کو وفد روانہ کیا جائے گا؟''

ڈاکٹر گنگولی: ہم کھود (خود) جا کر ونے کو چھوڑا لائے گا۔

بھرت سنگھ: اگر قصاب ہی سے جان بخشی کی بھیک مانگنا ہے۔ تو پھر خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔ کم از کم بات تو بنی رہے گی۔

ڈاکٹر گنگولی: پھر وہی Pessimism (دائمی یاس) کا بات۔ ہم ونے کو سمجھا کر اسے یہاں آنے پر راضی کرے گا۔

رانی جانہوی نے ادھر آتے ہوئے اس جملہ کے آخری الفاظ سن لیے۔ تمکنت آمیز لہجہ میں بولیں۔ ''نہیں ڈاکٹر گنگولی۔ آپ ونے پر اتنی مہربانی نہ کیجیے۔ یہ اس کی پہلی آزمائش ہے۔ اس میں اسے مدد دینا اس کے مستقبل کو تباہ کرنا ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اسے کسی سے دبنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اس نے جان کے

خوف سے اس ناانصافی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو سب سے پہلے میں ہی اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا لگا دوں گی۔''

رانی کے جوش بھرے الفاظ نے حاضرین کو متحیر کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دیوی آسمان سے یہ پیغام سنانے کے لیے اتر آئی ہے۔

ایک منٹ کے بعد کنور بھرت سنگھ نے رانی کے الفاظ کا مطلب بتلایا۔ ''میرے رائے میں ابھی ونے سنگھ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ اس کی آزمائش ہے۔ انسان بڑے سے بڑا کام جو کر سکتا ہے، وہ یہی ہے کہ اپنے ضمیر کی آزادی کے لیے مر مٹے۔ یہی انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ ایسے ہی امتحانوں میں کامیاب ہو کر ہمیں وہ درجہ حاصل ہوتا ہے کہ ہم پر قوم اعتبار کر سکے۔''

ڈاکٹر گنگولی: رانی ہمارا دیوی ہے۔ ہم ان کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پر دیوی لوگوں کا بات دنیا والوں کے بیوہار کرنے جوگ (قابل) نہیں ہو سکتا۔ ہم کو پورا امید ہے کہ ہمارا سرکار ضرور بولے گا۔

رانی: سرکار کی انصاف پسندی کی ایک مثال تو آپ کے سامنے ہی ہے اگر اب بھی آپ کو اس پر اعتبار ہو تو میں یہی کہوں گی کہ آپ کو کچھ دنوں تک کوئی دوا استعمال کرنی پڑے گی۔

ڈاکٹر گنگولی: دو چار دن میں یہ بات معلوم ہو جائے گا۔ سرکار کو بھی تو اپنی نیک نامی بدنامی کا ڈر ہے۔

مہیندر کمار بہت دیر کے بعد بولے۔ ''راہ دیکھتے دیکھتے تو آنکھیں پتھرا گئیں۔ ہماری امید اتنی سخت جان نہیں ہے۔''

دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کنور صاحب نے پوچھا..... ''کون صاحب ہیں؟''

ٹیلیفون سے۔ ''میں ہوں پران ناتھ۔ مسٹر کلارک کا تبادلہ ہو گیا۔''

کنور صاحب نے پوچھا..... ''کہاں کو؟''

ٹیلی فون سے جواب ملا۔ ''پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں جا رہے ہیں۔ گریڈ کم کر دیا گیا ہے۔''

ڈاکٹر گنگولی: اب بولیے میرا بات سچ ہوا کہ نہیں۔ آپ لوگ کہتا تھا، گورنمنٹ کا نیت بگڑا ہوا ہے۔ پر ہم کہتا تھا کہ اس کو ہمارا بات ماننا پڑے گا۔

مہیندر رکمار: اجی پر ان ناتھ مسخرا ہے۔ آپ سے دل لگی کر رہا ہوگا۔

بھرت سنگھ: نہیں۔ اس نے تو مجھ سے کبھی دل لگی نہیں کی۔

رانی: سرکار نے اتنی اخلاقی جرأت سے شاید پہلی بار کام لیا ہے۔

ڈاکٹر گنگولی: اب وہ جمانا (زمانہ) نہیں ہے جب گورنمنٹ پبلک اوپینین (رائے عامہ) کا انسلٹ (توہین) کر سکتا تھا۔ اب کونسل کا بات اس کو ماننا پڑے گا۔

بھرت سنگھ: زمانہ تو وہی ہے اور گورنمنٹ کے طرز عمل میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی سیاسی راز ہے۔

جان سیوک: ایوان تجارت نے میری تجویز کو منظور کر کے گورنمنٹ کے چھکے چھڑا دیئے۔

مہیندر رکمار: میرا ڈیپوٹیشن بڑے موقع سے پہنچا تھا۔

ڈاکٹر گنگولی: میں نے کونسل کو ایسا بالکل ہی ایک کر دیا تھا کہ ہم کو اتنا بڑا میجارٹی کبھی نہ ملا۔

اندو، رانی کے پیچھے کھڑی تھی۔ بولی۔ ''عرضداشت پر میری ہی کوشش سے اتنے آدمیوں کے نام درج ہوئے تھے۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہ اسی کی کرامات ہے۔''

نائیک رام اب تک چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ٹیلی فون کی بات ان کی سمجھ میں آئی۔ اب انہیں معلوم ہوا کہ لوگ کامیابی کا سہرا اپنے اپنے سر باندھنے کی فکر میں ہیں۔ ایسے موقع پر بھلا وہ کب

چوکنے والے تھے۔ بولے۔ ''سرکار یہاں بھی گا پھل بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ سول سارجنٹ کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ راجہ صاحب کی طرف سے پورا ایک ہجار (ہزار) لٹھیت جوان تیار بیٹھا ہوا ہے۔ ان کا حکم بحال نہ ہوا تو کھون کھرابا (خون خرابہ) ہو جائے گا۔ سہر میں طوپھان آ جائے گا۔ انہوں نے لاٹ صاحب سے یہ بات جرور ہی کہی ہوگی۔''

مہیندر صاحب: میں تو سمجھتا ہوں۔ یہ تمہاری دھمکیوں کی ہی برکت ہے۔

نا یک رام: دھرما اوتار۔ دھمکیاں کیسی۔ کھون کی ندی بہہ جاتی۔ آپ کا ایسا اکبال ہے کہ چاہوں تو ایک بار سہر لٹوا دوں۔ یہ لال صاپھے رکھے رہ جائیں۔

پربھو سیوک تمسخر سے کہا۔ ''سچ پوچھئے تو یہ اس نظم کا نتیجہ ہے جو میں نے ''ہندوستان ریویو'' میں چھپائی تھی۔''

رانی: پربھو! تم نے یہ چپت اچھی لگائی۔ ڈاکٹر گنگولی اپنا سر سہلا رہے ہیں۔ کیوں ڈاکٹر پڑی یا نہیں؟ ایک ایسی حقیر کامیابی پر آپ لوگ جامہ میں پھولے نہیں سماتے۔ اسے فتح نہ سمجھئے۔ یہ دراصل شکست ہے جو آپ کو منزل مقصود سے کوسوں دور ہٹا دیتی ہے۔ آپ کے گلے میں پھندے کو اور بھی مضبوط کر دیتی ہے۔ باجے والے سردی میں باجے کو آگ سے سینکتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اس میں سے اچھی آواز نکلے۔ آپ لوگ بھی سینکے جا رہے ہیں۔ اب ضربوں کے لیے پیٹھ مضبوط کر لیجیے۔

یہ کہتی ہوئی رانی جانہوی اندر چلی گئیں۔ مگر ان کے جاتے ہی انکی تنبیہ کا اثر بھی جاتا رہا۔ لوگ پھر وہی راگ الاپنے لگے۔

مہیندر کمار: کلارک صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ کس سے پالا پڑا تھا۔

ڈاکٹر گنگولی: اب اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ لوگ کتنا انصاپھ کرتا ہے۔

جان سیوک: اب ذرا اس اندھے کی بھی خبر لینی چاہیے۔

نا یک رام: صاحب۔ اسے ہار جیت کا کوئی خیال نہیں ہے۔ اس جمین کی دس گنی

بھی ملجائے تو بھی وہ اسی طرح رہے گا۔

جان سیوک: میں کل ہی سے مل میں کام لگا دوں گا۔ ذرا مسٹر کلارک کو بھی دیکھ لوں۔

مہیندر کمار کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے کہ اندو کو بھی یہ خوش خبری سناؤں۔ یوں تو وہ نہایت متین آدمی تھے مگر اس فتح نے ایک طفلانہ جوش مسرت پیدا کر دیا تھا۔ نشہ کا سا عالم تھا۔ رانی کے چلے جانے کے ذرا دیر بعد وہ خوش خوش ہنستے ہوئے نادانستہ طور پر اکڑتے ہوئے غرور سے سر اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اندو رانی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑی ہو کر بولی۔ ''آخر صاحب بہادر کو بوریا بندھنا سنبھالنا پڑا نا۔''

اندو: اب کل میں ان لیڈی صاحبہ کی ذرا مزاج پرسی کروں گی جو زمین پر قدم نہ رکھتی تھیں۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتی نہ تھیں۔ بلا کر دعوت کروں؟

مہیندر کمار: کبھی نہ آئے گی اور ضرورت ہی کیا ہے؟

اندو: ضرورت کیوں نہیں ہے جھینپے گی تو۔ سر تو نیچا ہو جائے گا۔ نہ آئے گی نہ سہی۔ اماں آپ نے تو دیکھا ہے صوفیہ پہلے کتنی غریب اور ملن سار تھی، لیکن کلارک سے شادی کی بات چیت ہوتے ہی دماغ عرش معلیٰ پر چڑھ گیا۔

رانی نے متانت سے کہا۔ ''بیٹی۔ یہ تمہارا وہم ہے۔ صوفیہ مسٹر کلارک سے کبھی شادی نہ کرے گی۔ اگر میں انسان کو کچھ پہچان سکتی ہوں تو دیکھ لینا۔ میری بات صحیح ہوتی ہے یا نہیں۔''

اندو: اماں۔ کلارک سے اس کی منگنی ہو گئی ہے۔ ممکن ہے درپردہ شادی بھی ہو گئی ہو۔ دیکھتی نہیں ہو۔ دونوں کیسے گھلے ملے رہتے ہیں؟

رانی: کتنے ہی گھلے ملے رہیں۔ مگر ان کی شادی نہ ہوئی ہے اور نہ ہو گی۔ میں اپنی تنگ نظر کے سبب صوفیہ کو کتنی ہی سبک سمجھوں۔ مگر واقعی وہ ایک وفا شعار عورت

ہے۔اس میں ذرا بھی شک نہیں ۔اسے خفیف کر کے تم پچھتاؤ گی۔

اندو: اگر وہ اتنی نیک ہے تو وہ آپ کے بلانے پر ضرور ہی آئے گی۔

رانی: ہاں مجھے یقین کامل ہے۔

اندو: تو بلا لیجیے۔ مجھے دعوت کا انتظام کیوں کرنا پڑے۔

رانی: تم یہاں بلا کر اسے خفیف کرنا چاہتی ہو۔ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتی ہوں کہ اگر وہ عیسائن نہ ہوتی تو آج کے پانچویں برس میں اس سے ونے کی شادی کرتی اور اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتی۔

اندو کو یہ باتیں پسند نہ آئیں۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ ذرا دیر میں مہیندر کمار بھی وہاں پہنچ گئے اور دونوں بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ کوئی لڑکا کھیل میں جیت کر بھی اتنا بدمست نہ ہوتا ہوگا۔

ادھر دیوان خانہ میں بھی مجلس برخاست ہوگئی اور لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ جب تخلیہ ہوگیا تو کنور صاحب نے نائیک رام کو بلا کر کہا۔ ''پنڈا جی۔ میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔ کرو گے؟''

نائیک رام: سرکار حکم ہو تو سر دینے کو حاضر ہیں۔ ایسی کوئی بات ہے بھلا!

کنور: دیکھو دنیا داری نہ کرو۔ میں جو کام لینا چاہتا ہوں وہ سہل نہیں ہے۔ زیادہ وقت، زیادہ عقل، زیادہ طاقت خرچ کرنی پڑے گی۔ جان کا بھی خطرہ ہے۔ اگر دل اتنا مضبوط ہو ہاں کرو ورنہ صاف صاف جواب دے دو۔ میں کوئی جاتری نہیں ہوں جس پر تمہیں اپنی دھاک بٹھانا ضروری ہو۔ میں تمہیں جانتا ہوں تم مجھے جانتے ہو۔ اس لیے صاف گفتگو ہونی چاہیے۔

نائیک رام: سرکار آپ سے دنیا داری کر کے بھگوان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ آپ کا نمک تو روئیں روئیں میں پیوست ہو رہا ہے۔ اگر میرے بس کی بات ہوگی تو پوری کروں گا چاہے جان ہی کیوں نہ جائے۔ آپ کے حکم کی دیر ہے۔

کنور: ونے کو چھڑا کر لا سکتے ہو؟

نائیک رام: سرکار اگر جان دے کر بھی لا سکوں گا تو کوتاہی نہ کروں گا۔

کنور: تم جانتے ہو میں نے تم سے یہ سوال کیوں کیا ہے؟ میرے یہاں سینکڑوں آدمی ہیں۔ خود ڈاکٹر گنگولی جانے کو تیار ہیں۔ مہیندر کو بھیجوں تو وہ بھی چلے جائیں گے، لیکن ان لوگوں کے سامنے میں اپنی بات نہیں بگاڑنا چاہتا۔ سر پر یہ الزام لینا نہیں چاہتا کہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ دھرم سنکٹ میں پڑا ہوا ہوں پر بیٹے کی محبت نہیں مانتی۔ ہوں تو انسان ہی۔ کاٹھ کا کلیجہ تو نہیں ہے۔ کیسے صبر کروں؟ اسے بڑے بڑے ارمانوں سے پالا ہے۔ وہی ایک زندگی کا سہارا ہے۔ تم اسے کسی طرح اپنے ساتھ لاؤ۔ اودے پور کے عملے دیوتا نہیں ہیں۔ انہیں لالچ دے کر جیل میں جا سکتے ہو۔ ونے سے مل سکتے ہو اور عملوں کی مدد سے انہیں باہر بھی لا سکتے ہو۔ اتنا کرنا تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ مشکل ہے ونے کو آنے پر راضی کرنا۔ اسے تمہاری عقل وہوشیاری پر چھوڑتا ہوں۔ اگر تم میری دردناک حالت سے انہیں بخوبی واقف کر سکو گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ چلے آئیں گے۔ بولو کر سکتے ہو یہ کام؟ اس کا محنتانہ ایک بڈھے باپ کی دعا کے علاوہ اور جو کچھ تم چاہو گے وہ پیش کیا جائے گا۔

نائیک رام: مہاراج کل چلا جاؤں گا۔ بھگوان نے چاہا تو ان کو ساتھ لاؤں گا نہیں تو منہ نہ دکھاؤں گا۔

کنور: نہیں پنڈا جی! جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کتنا پریشان ہوں تو وہ چلے آئیں گے۔ وہ اپنے باپ کی جان کو اپنے اصول پر قربان نہ کریں گے۔ ان کے لیے میں نے اپنی زندگی کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ یہ فقیروں کا بھیس ہے۔ کیا وہ میرے لیے اتنا بھی نہ کریں گے۔ پنڈا جی سوچو! جس آدمی نے ہمیشہ مخملی بستروں پر آرام کیا ہو اسے اس کاٹھ کے تخت پر آرام مل سکتا ہے؟ ونے کی محبت ہی وہ جادو ہے جس کے بس میں ہو کر میں یہ کٹھن تپسیا کر رہا ہوں۔ جب ونے نے تیاگ

(ترک) کا برت لے لیا (عہد کر لیا) تو پھر میں کس منہ سے اس بڑھاپے کی عمر میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرتا۔ یہ سب کانٹے رانی جانہوی کے بوئے ہوئے ہیں۔ اس کے آگے میری کچھ نہیں چلتی۔ میرا سرگ (بہشت) اسی کے کارن نرک (دوزخ) بن رہا ہے۔ اسی کے کارن میرا پیارا و نے میرے ہی ہاتھوں سے نکالا جاتا ہے۔ ایسا ہونہار بیٹا کھو کر یہ دنیا میرے لیے نرک ہو جائے گی۔ تم کل جاؤ گے؟ منیم سے جتنے روپے چاہو لے لو۔

نائیک رام: آپ کے اکبال سے کسی بات کی کمی نہیں ہے۔ آپ کی دیا چاہیے۔ آپ نے اتنے پرتابی (اقبال مند) ہو کر جو تیاگ کیا ہے وہ کوئی دوسرا کرتا تو آنکھیں نکل پڑتیں۔ سب کچھ چھوڑ دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہاں تو گھر میں بھونی بھانگ نہیں۔ جاتریوں کی سیوا ٹہل نہ کریں تو بھوجن کا ٹھکانا بھی نہ ہو پر بوٹی (بھنگ) کی ایسی چاٹ پڑ گئی ہے کہ ایک دن نہ ملے تو دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ کوئی آپ کی طرح کیا کھا کر تیاگ کرے گا۔

کنور: یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ تم گئے تو و نے کو لے کر ہی لوٹو گے۔ اب یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کیا و چھنا (رخصتانہ) دوں؟ تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟

نائیک رام: سرکار کی دیا بنی رہے۔ میرے لیے یہ کچھ کم نہیں ہے۔

کنور: تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میرا کام نہیں کرنا چاہتے۔

نائیک رام: سرکار ایسی بات نہ کہیں۔ آپ مجھے پالتے ہیں۔ آپ کا حکم نہ مانوں گا تو بھگوان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور پھر آپ کا کام کیسا۔ یہ تو اپنا ہی کام ہے۔

کنور: نہیں بھئی۔ میں تمہیں مفت میں اتنی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ یہ سب سے بڑا سلوک ہے جو تم میرے ساتھ کر رہے ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا ہوں جسے تم سب سے بڑا سمجھتے ہو۔ تمہارے کتنے لڑکے ہیں؟

نائیک رام نے سر جھکا کر کہا۔ ''دھرماتما اوتار۔ ابھی تو بیاہ ہی نہیں ہوا۔''

کنور: ارے یہ کیا بات ہے؟ آدھی عمر گزر گئی اور ابھی بن بیاہے بیٹھے ہو!

نائیک رام: سرکار۔ تکدیر (تقدیر) کے سوا اور کیا کہوں۔

ان الفاظ میں اتنی رقت انگیز مایوسی بھری ہوئی تھی کہ کنور صاحب پر نائیک رام کی دیرینہ اور دلی خواہش روشن ہوگئی۔ بولے۔ ''تو تم گھر میں اکیلے ہی رہتے ہو؟''

نائیک رام: ہاں دھرماوتار بھوت کی طرح اکیلا ہی پڑا رہتا ہوں۔ آپ کے اکبال سے دوہرے درجے کا گھر ہے۔ باگ بگیچے ہیں۔ گائیں بھینسیں ہیں۔ پر رہنے والا کوئی نہیں۔ بھوگنے والا کوئی نہیں۔ ہماری برادری میں انہی کا بیاہ ہوتا ہے جو بڑے بھاگوان ہوتے ہیں۔

کنور: (مسکرا کر) تو تمہارا بیاہ کہیں ٹھہرا دوں؟

نائیک رام: سرکار۔ ایسی تکدیر کہاں؟

کنور: تقدیر میں بنا دوں گا۔ مگر یہ قید تو نہیں ہے کہ کنیا بہت اونچے کل (خاندان) کی ہو؟

نائیک رام: سرکار۔ کنیاؤں کے لیے اونچا نیچا کل نہیں دیکھا جاتا۔ کنیا اور گئو تو پاک ہیں۔ براہمن کے گھر میں آ کر اور بھی پاک ہو جاتے ہیں۔ پھر جس نے دان لیا اس نے دنیا بھر کا پاپ ہجم کیا تو پھر عورت کی کیا بات ہے۔ جس کا بیاہ نہیں ہوا۔ اس کی جندگانی دوکوڑی کی ہے۔

کنور: اچھی بات ہے۔ ایشور نے چاہا تو لوٹتے ہی دولہا بنو گے۔ تم نے پہلے کبھی اس کی چرچا ہی نہیں کی۔

نائیک رام: سرکار۔ یہ بات آپ سے کیا کہتا۔ اپنے میل جول والوں کے سوا اور کسی سے نہیں کہی۔ کہتے لاج آتی ہے۔ جو سنے گا وہ سمجھے گا کہ اس میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہے۔ کئی بار لباریوں کی باتوں میں آ کر سینکڑوں روپے گنوائے۔ اب کسی سے نہیں کہتا۔ بھگوان کے آسرے بیٹھا ہوں۔

کنور: تو کس گاڑی سے جاؤ گے۔

نا یک رام: ہجور۔ ڈاک گاڑی سے چلا جاؤں گا۔

کنور: ایشور کرے۔ جلد لوٹو۔ میری آنکھیں تمہاری طرف لگی رہیں گی۔ یہ لو خرچ کے لیے لیتے جاؤ۔

یہ کہتے ہوئے کنور صاحب نے اپنے محاسب کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے نا یک رام کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اپنی گدی پر بیٹھ کر بولا..... ''بولو۔ کتنا ہمارا اور کتنا تمہارا۔''

نا یک رام: کیا یہ بھی کوئی وچھنا ہے۔

محاسب: رقم تو تمہارے ہاتھ آتی ہے۔

نا یک رام: میرے ہاتھ نہیں آ رہی ہے۔ ونے سنگھ کے پاس بھیجی جا رہی ہے۔ بچہ مصیبت میں بھی مالک سے نمک حرامی کرتے ہو۔ ان پر تو مصیبت پڑی ہے اور تمہیں اپنا گھر بھرنے کی دھن ہے۔ تم جیسے لالچیوں کو تو ایسی جگہ مارے جہاں پانی نہ ملے۔

محاسب نے شرمندہ ہو کر نوٹوں کا ایک پلندہ نا یک رام کو دے دیا۔ نا یک رام نے نوٹوں کو گن کر کمر میں باندھا اور محاسب سے کہا۔ ''میری کچھ وچھنا دلاتے ہو۔''

محاسب: کیسی وچھنا؟

نا یک رام: نکد روپیوں کی نوکری پیاری ہے کہ نہیں؟ جانتے ہو نا کہ یہاں سے نکال دیئے جاؤ گے تو کہیں بھیک نہ ملے گی۔ اگر بھلا چاہتے ہو تو پچاس روپیوں کی گڈی بائیں ہاتھ سے ادھر بڑھا دو نہیں تو جا کر کنور صاحب سے سب جڑے دیتا ہوں۔ کھڑے کھڑے نکال دیئے جاؤ گے۔ جانتے ہو کہ نہیں رانی جی کو؟ نکالے بھی جاؤ گے اور گردن بھی ناپی جائے گی۔ ایسی بے بھاؤ کی پڑیں گی کہ چندیا گنجی ہو جائے گی۔